قرآن کا معاشی نظام

قرآن کریم' نظری پند و نصائح کا مجموعہ یا پوجا پاٹ کے طور طریقے سکھانے والی کتاب نہیں۔ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے عملی ہدایات دیتا ہے تاکہ ان کے مطابق انسان' ایک نظام متشکل کر کے صحیح انسانی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ زندگی جن ارتقائی مراحل کو طے کر کے موجودہ سطح (یعنی پیکر انسانی) تک پہنچتی ہے اس میں طبعی نظام حیات یعنی اس کے جسم کی پرورش اور نشوونما کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ضوابط اخلاق و تمدن۔ تمام پند و نصائح۔ دین کا ہر قسم کا تقاضا' عبادات و مناسک شریعت' فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض۔ غرضیکہ ہر قسم کی راہنمائی صرف زندہ انسانوں کے لیے ہے۔ مردہ (یعنی انسان کی لاش) نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر' نہ گنہگار ہوتا ہے' نہ معصوم۔ وہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بری اور ہر نوع کے حقوق و فرائض سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی جان (یعنی) اس کی طبعی یا جسمانی زندگی' اس قدر گراں بہا ہے کہ (اس نے کہا ہے کہ) جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا۔ اس نے گویا تمام نوع انسان کو ہلاک کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا اس نے (یوں سمجھو گویا) تمام نوع انسان کی جان بچالی۔ (۵/۳۲) اسی لیے اس نے جرم قتل کی سزا سنگین ترین مقرر کی ہے۔ (۹۳-۴/۹۲) اب ظاہر ہے کہ جب انسان کی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے تو جن اسباب و ذرائع پر اس کا دارومدار ہے' ان کی اہمیت کس قدر ہوگی؟ ان اسباب و ذرائع کو' قرآن کریم کی اصطلاح میں رزق اور (ہمارے ہاں) عرف عامہ میں روٹی کہا جاتا ہے۔ روٹی سے متعلق مباحث کو' دور حاضر کی علمی اصطلاح میں معاشیات اور علم معیشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے روٹی

کے مسئلہ یا معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کے افتتاحیہ (یعنی سورہ فاتحہ) میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ "دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کو جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔" (۶-۱/۵)

اور سورہ نحل میں بتایا گیا ہے کہ امن اور رزق فراواں' انعامات خداوندی میں سے ہیں۔ (۱۶/۱۱۲) ص ا اور بھوک اور خوف' خدا کا عذاب ہے (۱۶/۱۱۲) اس نے "جنت آدم" کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں نہ کسی کو بھوک اور پیاس کی احتیاج ستائے گی' نہ مکان اور لباس سے محرومی ہوگی۔ (۲۰/۱۱۸) اس میں ہر شخص کو' جہاں بھی وہ ہو گا' فراوانی سے کھانے کو مل جائے گا۔ (۲/۳۵' ۷/۱۹) اس نے سورہ طہ میں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو شخص ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کر دی کہ جس شخص کی یہاں روزی تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ (۲۰/۱۲۴) دوسری جگہ کہہ دیا کہ جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہو گا۔ (۱۷/۷۲) سورہ مائدہ میں ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ' تورات و انجیل کا اتباع کرتے تو ہم انہیں زمین و آسمان سے بکثرت کھانے کو عطا کر دیتے۔ (۵/۶۶) یعنی ان پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ (۷/۹۶)

دعائے ابراہیمیؑ

رزق کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ حضرت ابراہیمؑ جب "دنیا میں خدا کے پہلے گھر" کی تعمیر سے فارغ ہوئے' تو انہوں نے حریم کعبہ میں کھڑے ہو کر' خدا سے جو پہلی دعا مانگی اس میں کہا کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو یہاں کے رہنے والوں کو امن اور فراوانی سے سامان رزق عطا فرما" (۲/۱۲۶) اس دعائے ابراہیمؑ کو سورہ ابراہیمؑ میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (۱۴/۳۷) اور اہل مکہ کو اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ خدا نے انہیں کس طرح ہر خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور کس طرح ہر طرف سے رزق فراواں ان کی طرف کھنچے چلا آتا ہے۔ (۱۰۶/۴) - (۲۸/۵۷)

تمہیدی اصول

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے روٹی کے مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے اور اس کی یہی وہ اہمیت ہے جس کے پیش نظر اس نے اس کے لیے چند نظری ہدایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مکمل عملی نظام عطا کر دیا ہے۔ میں آج کی نشست میں قرآن کے اس عملی نظام کو آپ حضرات کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس نظام کو سمجھنے کے لیے دو ایک بنیادی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے جنہیں نظرانداز کر دینے سے وہ الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے' ایک ہی معاشی نظام کو ایک گروہ عین مطابق اسلام قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے' کفر ہی نہیں بلکہ "کفر عظیم" ٹھہراتا ہے۔ وہ تمہیدی نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی مخاطب قوم وہ تھی۔ جس کے ہاں ایک ایسا معاشی نظام رائج تھا جو اس نظام کی یکسر ضد تھا۔ جسے قرآن متشکل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک قائم شدہ نظام کی جگہ دوسرا نظام جو اس کی یکسر ضد ہو۔ شباشب نہیں لایا جا سکتا' بالخصوص' جب اس نئے نظام کے لیے ان لوگوں کے قلب و دماغ میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی بھی ضروری ہو' جن کے ہاتھوں اسے متشکل ہونا ہے۔ قرآن کریم نے یہ تبدیلی تئیس برس میں پیدا کی اور اس طرح اس قوم کو' رفتہ رفتہ' آہستہ آہستہ' قدم بہ قدم بتدریج اس نظام نو تک لے گیا جو اس کی تعلیم کا منتہی تھا۔ فساد راتوں رات برپا کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب اسی طرح بتدریج لایا جاتا ہے۔ قرآنی نظام معیشت کے سمجھنے کے لیے ہمیں ان تدریجی کڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنا ہو گا جن کو ملاتے ہوئے وہ آخری منزل تک پہنچا تھا۔

قرآن کریم جس مرتب شکل میں امت کو دیا گیا ہے وہ اس کے نزول کی تاریخی ترتیب نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو سورہ (یا آیت) سب سے پہلے نازل ہوئی تھی' وہ قرآن میں سب سے پہلے رکھی گئی ہے اور سب سے آخری سورہ یا آیت وہ ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ترتیب میں ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا ورنہ میں اپنے مطالعہ قرآن کی بناء پر اس کی وضاحت کرتا

کہ جس کتاب عظیم کو تمام نوع انسان کے لیے' ہمیشہ کے لیے ضابطہ ہدایت بننا تھا' اس کے لیے یہی انداز ترتیب کس طرح انسب ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب قرآن کی موجودہ ترتیب' اس کی تنزیلی ترتیب نہیں تو ان کڑیوں کو کیسے مرتب کیا جائے گا جن کے مطابق' وہ اپنے نظام کو' اس کے نقطہ آغاز سے' مقام تکمیل تک لے گیا تھا۔ بظاہر یہ مسئلہ کچھ دقت طلب سا نظر آتا ہے لیکن یہ درحقیقت ایسا نہیں۔ اگر قرآن کریم کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان تمام کڑیوں کو باسانی آپس میں ملایا جا سکتا ہے جن کے اتصال سے ہم اس نظام کی پہلی کڑی سے آخری نقطہ تک' موج خرام یار کی طرح گل کترتے' بلاوقت و بلاتردد پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ اسی انداز سے کیا ہے اور اس سے یہ راستے کتنے آسان ہو گئے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ ان کڑیوں سے بخوبی لگا سکیں گے جو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

نشان منزل

قرآن کریم نے سب سے پہلے اس منزل کا نشان واضح طور پر متعین کر دیا ہے جس تک وہ ہمیں بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس نشان منزل کی وضاحت سورہ فاتحہ کی پہلی آیت میں ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۱\۱)

خدا موجب حمد و ستائش اس لیے ہے کہ اس نے جملہ اشیائے کائنات کی پرورش اور نشوونما کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اسے ربوبیت عالمینی کہتے ہیں اور یہ انتظام وہ ہے جسے خدا کے سوا نہ کوئی اور کر سکتا تھا' نہ کر سکتا ہے' نہ کر سکے گا۔ (۳۵/۳) خارجی کائنات میں اس کا یہ نظام ربوبیت کس طرح کارفرما ہے۔ یہ سوال ہمارے موضوع زیر نظر سے خارج ہے۔ کرہ ارض کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ "اس میں کوئی ذی حیات (دآبہ) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (۱۱/۶) اور ان میں سے انسانوں کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ "ان کے اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہم ہیں۔"

(۶/۱۵۲) (۱۷/۳۱)' (۲۹/۶۰)

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم ہر انسان کو براہ راست رزق پہنچاتے ہیں۔ بالکل نہیں (۳۶/۴۷) ہماری یہ ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ جو انسانی نظام' خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے اور اس کے اس نظام کو قرآنی نظام معیشت' یعنی جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہونے کی مدعی ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جملہ افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی (رزق) بہم پہنچائے۔ اب آپ ان کڑیوں کو دیکھئے جن کے باہمی جڑنے سے یہ نظام بتدریج اپنے مقام تکمیل تک پہنچتا ہے۔

○○○

منزل اول

انفرادی زندگی

نزول قرآن سے' اس نظام کی آواز اس معاشرہ میں بلند کی جاتی ہے جو نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں ایک طرف ایسے متمول افراد ہیں جو اپنی دولت کے نشہ میں' بدمست ہیں اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال جو نان شبینہ تک سے بھی محروم ہیں۔ اس معاشرہ میں سب سے پہلے متمول لوگوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے ان مسکینوں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جائے گا۔ (۶۹/۳۴-۳۵)۔ (۷۶/۸-۱۰)

انفرادی اپیل

اخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا' اس سے ابھی زیادہ بحث نہیں کی جاتی۔ لیکن انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلہ جس میں بیشتر انسان

اپنی بنیادی ضروریات زندگی تک سے محروم رہتے ہیں تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا' جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ اس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتائے گا کہ یہ اس لیے ہوا کہ تمہارے ہاں عزت و تکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی۔ تم میں سے جو تنہا رہ جاتا تھا تم اسے عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رک جاتا تھا' تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے' نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ (۲۰-۱۷/۸۹) ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعی انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے' (انہیں جماعت مومنین کہا جاتا تھا۔) ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پر لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں' یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا۔ (۹-۸/۷۶) یہ نہایت سخت گھاٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا۔ (۱۶-۱۱/۹۰) جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعوئ ایمان کی تکذیب کرے گا۔ (۳-۱/۱۰۷) تمہارے دعوئے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیا کچھ دیتے ہو۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں۔

صدقات

اس کی ابتداء تم اپنے اعزہ و اقارب کی تمیز سے بلند ہو کر' ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ (۲/۲۱۵' ۳۰/۳۸) لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو اس کے سر پر احسان کی من بھر کی سل رکھ دو کہ وہ بیچارہ ساری عمر اس کے بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اسے لوگوں کو دکھا دکھا کر' اپنے پندار نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقل فریب کار تم سے یہ کہے گی کہ ہم دوسروں پر خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ ان لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لیے لوگوں میں اس کا چرچا کریں' تو ہم اپنی دولت دوسروں پر خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ

ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے اسے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوق انسانیت محفوظ ہو جائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲/۲۶۱-۲۷۶) (۴۳/۳۱)

مال و دولت میں اصلاح

قرآن کریم نے اس پہلی اسٹیج پر، جہاں ایک طرف ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پر ترغیب و تحریص دی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ، باطل طور پر مت کھاؤ۔ (۲/۱۸۸) (۴/۲۹) اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ، لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں۔ (۹/۳۴) یتیموں کے مال کی حفاظت کرو۔ (۴/۶۔ ۶/۱۵۳۔ ۱۷/۳۴) اگر عورت کچھ کمائے تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ طور پر اس کے مالک نہ بن جائیں۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا۔ (۴/۳۲) لین دین کے معاملات کے متعلق تاکید کی کہ انہیں ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔ (۲/۲۸۲) مقروض اگر تنگدست ہو تو اسے قرض کی ادائیگی کے لیے مہلت دو اور اگر اس میں ادائیگی قرضہ کی استطاعت نہ ہو، تو اسے قرضہ معاف کر دو۔ (۲/۲۸۰) اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو۔ (۲/۱۸۰۔ ۵/۱۰۶) اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوئی تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کر دو جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔ (۴/۷۔ ۱۲-۱۱/۴) اور جن کی رو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و مستاجر (مزدور) کے تعلقات میں حسن معاملہ کے سلسلہ میں بار بار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو۔ خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری، قاعدے اور معاہدے کے مطابق ادا کرو۔

(۶/۱۵۳، ۷/۸۵، ۱۱/۸۴، ۱۷/۳۵، ۸۳/۱-۳)

زرعی اصلاح

عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی۔ اس لیے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی اصلاح کی طرف مبذول کرائی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ، اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دو اور زمین کی پیداوار میں سے بھی (۲/۲۶۷) اسے خدا کا حق، کہہ کر پکارا گیا۔ (۶/۱۴۲) (ایسا کیوں کہا گیا، اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔) جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جو تمہارے موجودہ مقامات عزت و تکریم کو الٹ کر رکھ دے گا۔ اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے "خدا کا حق" محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانہ گندم جل کر راکھ ہو جائے گا۔ (۶۸/۱۷-۳۳، ۱۸/۳۲-۴۴) اور تمہارے بال بچوں تک تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ (۲/۲۶۶)

منزل دوم

اجتماعیت کی طرف اقدام

منزل اول میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں، وہ لوگ جو اس دعوت انقلاب کی صداقت کے قائل ہوگئے۔ اس داعی انقلاب کے گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہیے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہو گیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ منزل اول میں، افراد سے کہا گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کی اپنے طور پر مدد کریں۔ (اسے صدقات سے تعبیر کیا گیا تھا۔)

صدقات کا اجتماعی نظم و نسق

اب کہا کہ صدقات جمع کرو۔ بلکہ اس مرکز نظام (یعنی نبی اکرمؐ کیونکہ اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس نظام کے مرکز اول تھے) سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو۔ (۹/۱۰۳) اور اس مال کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لیے ان مدات پر صرف کرو جن کا ذکر سورۃ توبہ کی آیت نمبر۶۰ میں آیا ہے۔ (یہ صدقات کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں زکوٰۃ کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے آئے گا۔) پہلے کہا گیا تھا کہ اہل حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیش نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ "قرض اللہ کا دیا کرو۔" (۵۷/۱۸، ۷۳/۲۰) یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لیے اپیل کرے، تو جو کچھ کسی سے بن پڑے، اس دے دیا کرے۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صرف کرے گا اور تھوڑے عرصے کے بعد جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہو جائے گا اور یہ نظام نو پوری طرح متشکل، تو جو کچھ تم اب "اللہ کو" بطور قرض دو گے، اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی۔ (۸/۶۰) لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا، تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لیے تم اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول نہ لو۔ (۲/۱۹۵) یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہوگی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۴۷/۳۸) انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وقت پر تمہارے کام آئے گا۔ (۲/۲۶۸) لیکن تم اس فریب میں نہ آ جانا۔ معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ ایسا سمجھنے والے (کہ ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچا لے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے، تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں۔ (۴/۳۷، ۵۷/۲۴، ۹۲/۸-۹) یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفاد انسانیہ کے لیے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہوگی، بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ (۹۲/۱۸) تمہاری طبعی نشوونما بھی اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی جو درحقیقت منتہی و مقصود ہے موجودہ سطح زندگی کی تمام تگ و تاز اور جدوجہد کا----- انسانی

ذات کی نشوونما کو اصطلاح میں "قرب خداوندی" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حد بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔ یہ "تقرب الی اللہ" مال و دولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اسے "خدا کو دے دینے" سے ہوتا ہے۔ (۳۷/۳۴) اس میں شبہ نہیں کہ زن و فرزند کی طرح' مال و دولت میں بھی کشش و جاذبیت ہے۔ (۳/۱۴)

مال و دولت کے نظام میں اصلاح

لیکن اگر زن و فرزند یا مال و دولت کی جاذبیت' اجتماعی مفاد انسانیت پر غالب آ جائے تو یہی زن و فرزند اور مال و دولت فتنہ بن جاتے ہیں (۶۴/۱۵) اس لیے تم انفرادی مفاد پرستی کے فریب میں نہ آؤ۔ اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی (۱۷-۶۴/۱۶) انفرادی دولت جمع کرکے یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہوگئے ہو۔ تم خود کفیل (SUFFICIENT SELF) ہو گئے ہو۔ قطعاً نہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہو جاتا ہے۔ (۱۱-۹۲/۸' ۹۲/۷)

سائل و محروم کا حق

منزل اول میں ضرورت مندوں کی امداد کے لیے اپیل کی گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے۔ تم انہیں بطور امداد کچھ دو۔ لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورتمندوں کا حق ہے یعنی وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر' بطور استحقاق--- (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں۔ (۵۱/۱۹' ۲۵-۷۰/۲۴) اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کرو گے تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی۔ حق کی ہوگئی۔ خیرات لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبہ احسان ابھرتا ہے۔ لیکن جو چیز بطور حق وصول کی جائے۔ اس سے نہ لینے والے کے دل

میں احساس کمتری (INEERIORITY COMPLEX) پیدا ہوتا ہے۔ نہ دینے والے کے دل میں جذبہ برتری (SUPERIORITY COMPLEX)۔

مال غنیمت

عربوں کے ہاں' مال غنیمت بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا اور ان کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں جو کچھ کوئی دشمن کا لوٹ لے' وہ اسی کا ہو جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مال غنیمت' انفرادی ملکیت نہیں ہو گا۔ اسے مرکز میں جمع کرنا ہو گا۔ مرکز اس میں سے ایک حصہ اجتماعی ضروریات کے لیے الگ کر کے باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۱' ۸/۴۱) اس ایک تبدیلی سے نہ صرف یہ کہ اس ذریعہ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہو گئی' بلکہ جنت کا جذبہ محرکہ بھی بدل گیا۔ پہلے جنگ کا جذبہ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا تھا۔ جو جتنا حاصل کر سکے' لے جائے۔ اب جذبہ حقوق انسانیت کی مدافعت قرار پا گیا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں قتال فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں جنگ واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفاد انسانیہ کے لیے بلا مزدور معاوضہ کیا جائے' اسے قرآن کی رو سے فی سبیل اللہ (یعنی اللہ کی راہ میں) کہا جاتا ہے۔

دولت کا اکتناز

دولت اسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں رہے۔ خود لفظ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ لیکن انفرادی ہوس' زر پرستی اسے گردش میں رکھنے کے بجائے جمع کر کے روک لیتی ہے۔ اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام الٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز۔ یعنی اسے جمع کر کے روک رکھنا۔ سنگین ترین جرم ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے' دونوں' بری طرح جھلتے اور جلتے ہیں۔ (۹/۳۴۔۳۵) یہ شعلے ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ (۱۰۴/۲۔۷) یہ اس کی آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں

پہاڑ کے لاوے کی طرح ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ (۱۸-۱۵/۷۰)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اسے پورے کے پورے معاشرہ کے رگ و پے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ (۷/۵۹)

ربو قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات و تاکیدات کے بعد اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ روپیہ مبادلہ اشیائے ضروریہ کا ذریعہ ہے۔ اس سے ازخود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے۔ اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہو گا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی رہے کہ وہ جتنی دیر جی چاہے پڑا رہے' اس میں کوئی اضافہ نہ ہو' تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھ چھوڑنا حماقت ہو گا۔ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی کو سود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آئے گا۔ یعنی اب آپ کا روپیہ' اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ' محنت سے نہیں بلکہ روپے سے ازخود پیدا ہو' اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں ربو کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ربو کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم۔ ایسا جرم جسے اس نے اسلامی نظام کے مدمقابل ایک باغی نظام قرار دیا اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلان جنگ سمجھیں۔ (۲۷۹-۲/۲۷۵) دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ ربو سے تمہاری انفرادی دولت میں بے شک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظام معیشت کے نتائج و عواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجام کار اس سے اجتماعی دولت میں بے حد کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ دوسروں کی محنت کا غاصب بن کر' قوت عمل سے محروم اور سعادات انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم

ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی ہے اور آخر الامر بھڑک اٹھتی ہے۔ (۱۲۹-۱۳۰/ ۳)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی ربو ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ اس سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا وہ بھی ربو ہے (۳۰/۳۴) اسے دور حاضر کی اصلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (PARTNERSHIP SLEEPING) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لیس للانسان الا ماسعی (۳۹/ ۵۳) معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربو ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

ربو کو حرام قرار دے کر' قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔

زمین کے متعلق اگلا قدم

اب آگے بڑھیے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ بات اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت پڑتی ہے نہ ارسطو کے منطق کی حاجت۔ خدا نے اپنے آپ کو الحیی کہنے کے ساتھ ہی القیوم بھی کہا ہے۔ یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے زندگی عطا کی تو زندگی کے قائم رہنے کے لیے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی' اسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیام زندگی کے لیے روشنی' حرارت' ہوا پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو انسان کے پیدا کرنے سے پہلے مہیا کر دیا۔ روشنی' حرارت' ہوا اور پانی تو عام طور پر سطح ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝ (۱۵/۲۰)

''ہم نے اس میں تمہارے لیے سامان معیشت رکھا ہے اور ان کے لیے بھی جن کے تم

رازق نہیں ہو۔" آپ غور کیجئے کہ "معیشت" کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴) دوسری جگہ اس نے اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ کہا ہے۔ (۷۹/۳۳، ۸۰/۳۲)

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ارض اور دیگر ذرائع حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رو سے، کوئی شخص، ان ذرائع حیات (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے۔ جو تمام نوع انسان کے لیے مشترکہ اور یکساں وجہ قیام زندگی ہوں۔ آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے یہ قطعہ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جایئے اور اس شخص تک پہنچ جایئے جس نے سب سے پہلے اس قطعہ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو، اس پر اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائع حیات میں سے کسی پر کسی شخص کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اس نوع انسان کے خلاف جرم عظیم ہے جس کی زندگی کے قیام کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانہ قدیم سے رواجاً یا قانوناً جائز چلی آ رہی تھی۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لیے بڑے محکم دلائل پیش کیے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب "آسمانوں کے اوپر" خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی الوہیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح الہ السماء ہے، اسی طرح الہ الارض بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴) دوسری جگہ ہے۔ وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ (۶/۳) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا کھلا ہوا شرک

ہے۔ (۲۲-۲۱/۲۱) سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم الہ اختیار نہ کرو۔ الہ صرف ایک ہے اور وہ الہ وہ ہے لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۲-۵۱/۱۶) سموات اور ارض میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ اس لیے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر' انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔ (۲/۲۲) اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا اور تمام ذی حیات کے لیے ذریعہ رزق بنایا ہے۔ (۶۱-۶۰/۲۹)

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسولؐ! اب تم ان سے پوچھو کہ لمن الارض ومن فیھا زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے لے کر۔ اور اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (۸۵-۸۴/۲۳) ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی ملک ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لیے حلال و طیب ہوگی' ورنہ تم شیطان کے نقش قدم پر چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو۔ (۲/۱۶۸)

معاوضہ محنت کا

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ روشنی' حرارت' ہوا' پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں ازخود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دلنشیں انداز میں واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف اپنی محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو۔ باقی "خدا کا حصہ" ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو۔ (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو) اسی قاعدے

کے مطابق' زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو اور حق مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات نمبر ۶۳ تا ۷۴ میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنئے۔ فرمایا:

(اس مقصد کے لیے تم ذرا اس نظام پر غور کرو۔ جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو' تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر' اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا:

پھر کھیتی کے اگنے کے بعد' اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آ جائے جس سے اگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف' ہماری محنت اور بیج بھی بیگار میں گئے۔

اس کے بعد ہے:

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کو اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کر لیتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے' صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔ اس کے آگے ہے:

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کرکے' اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا---- رگ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا۔ تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ:

(رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظام خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ للذا اس کے ماحاصل (سامان زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہ تمام ذرائع پیداوار ازخود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں' نہ خریدے ہوئے۔

یہ تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لیے سامان زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں' محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ للذا تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ' سامان پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔" سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ متاعا للمقوین یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لیے سامان پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (۲۱/۲۷' ۳۰/۶۷' ۳۲۔ ۸۰/۲۴) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں' اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ "بے حد و نہایت" زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے' ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس اسی قدر رقبہ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش

کے لیے کافی ہو۔ اس طرح اس نے زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کر دی۔

رقبوں کی تحدید

سورۃ الرعد ہے کہ داعی انقلاب حضور نبی اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لیے میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے' کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے جواب میں کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو کہ اس کی تکمیل تمہاری موجودگی میں ہوگی یا تمہاری وفات کے بعد' تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ تکمیل ہو کر رہے گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں اور خواہ اس کے بعد تم دیکھتے نہیں کہ:

ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہوگی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔ (۱۳/۴۱)

سورہ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاع حیات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ سے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔ (۲۱/۴۴) زمینداری کی بناء پر جو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے' اس کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتداء کر دی

تیسری منزل

تکمیل کار

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ اب اسلامی مملکت وجود میں آ گئی ہے اور خدا نے ربوبیت عالمینی (یعنی تمام افراد کو سامان نشوونما

دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر پر لے لی ہے۔

اسلامی مملکت کی وجہ جواز

یہی اس مملکت کے وجود کی وجہ جواز تھی۔ سورۃ الحج میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ---- (۲۲/۴۱)

"یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔"

یہ آیۃ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجہ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ میں اس وقت "اقامت صلوٰۃ" کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ اپنے آپ کو ایتائے زکوٰۃ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ یہی ہمارا موضوع زیر نظر ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا" یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری "زکوٰۃ دینا" ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے

ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مالدار ایک خاص شرح کے مطابق اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کرکے اسے متعین مصارف کے مطابق خرچ کرے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رو سے، حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعینہ رقم ہے جسے مالدار (صاحب نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے، قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی اس میں "زکوٰۃ" کے مصارف کا کوئی ذکر ہے۔ (جنہیں زکوٰۃ کے معنی میں "نشوونما" لہذا "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہوں گے سامان نشوونما عطا کرنا۔ کہ وہ نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیت عالمینی اور رزاقیت کی وہ ذمہ داری، جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، پوری کرے۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو

کس طرح پورا کرے گا۔ اس کی تفصیل قرآن کریم میں بڑی شرح و بسط سے دی گئی ہے۔ اسی کا نام "قرآن کا معاشی نظام" ہے۔

خدا سے معاہدہ

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے) اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

(۹/۱۱۱)

یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا، اپنا مال اور اپنی جان، خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ (۴۸/۱۰) اس طرح، ایک عبد مومن کا جان و مال، انفرادی ملکیت کے بجائے، اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اسے اس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت، جس کا وعدہ خدا نے بے شمار مقامات پر کر رکھا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام میں مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی وہ "خدا کا مال" ہو جاتا ہے۔ (۲۴/۳۳)

اختلاف صلاحیت

قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف بھی اور کم و بیش بھی۔ میں اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اس امر واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآن نقطہ نگاہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ قرآن کہتا ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام باسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں۔ (۴۳/۳۲) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی

ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا کہ "اکتساب رزق کے سلسلہ میں، مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہیے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اشتراک سے کمائی میں اس قدر اضافہ ہوا ہے۔ لوگ یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے؟ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزد و معاوضہ ملی تھی (۱۶/۷۱، ۱۶/۵۳)

قارونیت

اس نے کہا کہ قارون (جسے قرآن نظام سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔) بھی اسی فریب میں مبتلا تھا جب اس نے کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) میرا مال و دولت، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے۔ (۳۹/۴۹) دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کا احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ اور نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (۱۰۲/۸) تو (ہرچند اسے اس قسم کی باز پرس پر یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کے لیے) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیرات کے طور پر "خدا واسطے" دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی۔ جس طرح اس دنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب۔ (۴۱/۵۰)

قل العفو

یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد' قرآن کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے اور قطعی طور پر طے ہو گیا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ اے رسول! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔ (۲/۲۱۹) حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ دوسرے کی ضرورت' تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔ (۵۹/۹)

اس (قل العفو کے) فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے طے کر کے رکھ دیا۔ اس سے کسی کے پس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) نہ رہی اور جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قرض خواہ اور مقروض' مالک مکان اور کرایہ دار' زمیندار اور کاشتکار' کارخانہ دار مزدور' غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہو گیا۔ اور یوں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افراد انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لیے سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ (۵۵/۱۰) اس لیے ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ یہ

ذریعہ رزق، تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) یہ تمام نوع انسان کے لیے، خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○ (۱۷/۲۰) اور جو چیز تمام انسانوں کو بطور علیہ ملی ہو، کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر پھاٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حد بندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ، رزق کے ان چشموں کو جنہیں، آب رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیے تاکہ ہر ضرورتمند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے۔ اپنے لیے روک لیتے ہیں، وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹ کر ان کے منہ پر مار دی جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ○ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ ایسے نمازیوں کے لیے انجام کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے۔ وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۱-۷) اور رزق کے آب رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیب دین نہیں تو اور کیا ہے؟ زمین کی اس پوزیشن کو قرآن کریم نے، قوم ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔

ارض اللہ

اس نے کہا کہ قوم ثمود کی معیشت کا مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گردو

نواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبر انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سرفرازان قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے ان سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (۷/۷۳) یہ زمین خدا کی ہے۔ نہ تمہاری ہے نہ میری۔ اور یہ مویشی بھی اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے چریں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حد بندیاں قائم کردو کہ اس کی مخلوق اس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جاسکے۔ (۷/۷۳ ' ۱۱/۶۴) (سرزمین مدین میں اس قسم کا واقعہ حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آیا تھا جہاں صاحب اقتدار سرداروں کے چرواہے کمزور و ناتواں لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے (۲۸/۲۳) انہوں نے کہا کہ اس کا عملی طریق کیا ہونا چاہیے۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ یہ بڑی آسان بات ہے۔ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۶/۱۵۵ ' ۹۱/۱۳) تم جانوروں کی باریاں مقرر کردو۔ ہر جانور' بلا تخصیص اس کے کہ وہ کس کا جانور ہے۔ اپنی اپنی باری پر پانی پی لے۔ "باریاں مقرر کرنے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں ہر ایک کا اشتراک ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ارض اللہ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کوئی ذہنی تصور یا نظری عقیدہ نہیں۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین تمام نوع انسان کے لیے ذریعہ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا' اور عملاً اسے زید' بکر' عمر کی ملکیت میں دے دینا' قرآن کی رو سے شرک ہے' کفر ہے' تکذیب' دین ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

باطن الارض للہ ظاہر است
ہرکہ ایں ظاہر نہ بیند' کافر است

اس نظام کی مخالفت

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق وہ معاشی نظام جسے قرآن کریم' نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے متعین کرتا ہے۔ آپ اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ میں ربوبیت کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ یہی نظام' حضرت انبیاء کرامؑ نے اپنے اپنے وقت میں' اپنی اپنی قوم کے سامنے پیش کیا لیکن مترفین کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ مترفین کے معنی ہمارے دور کی اصطلاح میں۔ سرمایہ دار طبقہ (CAPITALISTS) ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) ہم نے کسی قوم کی طرف کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس نے یہ انقلابی پروگرام پیش کیا ہو اور وہاں کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔ اس آیہ جلیلہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ یعنی:

(۱) حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف سے جو نظام پیش کیا جاتا تھا' وہ نظام سرمایہ داری کی ضد تھا' اسی لیے سرمایہ دار طبقہ اس کی اس قدر مخالفت کرتا تھا اور (۲) نظام سرمایہ داری اور نظام خداوندی کی کشمکش' کچھ ہمارے دور کی خصوصیت نہیں' جو یونہی ہنگامی طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا شروع سے ہوتا آرہا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر کوئی جماعت اس نظام خداوندی کو لے کر کھڑی ہو جائے اور اپنی تگ و تاز میں استقامت سے کام لے تو یہ نظام کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ خواہ سرمایہ دار قوتیں اس کی مخالفت میں کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف کر دیں۔ سورہ انفال میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اس نظام کی مخالفت کرنے والے لوگ' بے دریغ روپیہ خرچ کریں گے کہ عوام کو خدا کی راہ کی طرف آنے سے روکیں۔ فَسَیُنْفِقُوْنَھَا وہ اپنی ان مذموم کوششوں کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہاتے چلے جائیں گے۔ ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً لیکن ان کا یہ روپیہ کسی کام نہیں آئے گا۔ انہیں افسوس ہو گا کہ انہوں نے خواہ مخواہ اتنا روپیہ ضائع کیا۔ ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ (۸/۳۶،

اس لیے کہ آخرالامر انہیں شکست ہوگی۔ مذہبی پیشوا۔ احبار و رہبان۔ علماء و مشائخ۔ اس روپے کو، جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جانے کے لیے صرف کیا جائے گا۔ خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ لیکن اس کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔
(۹/۳۴) یہ مطففین، جو اپنے واجبات تو پورے پورے وصول کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کے حقوق کبھی ادا نہیں کرتے، خدا کے راستے سے، پرکاہ کی طرح ہٹا دیئے جائیں گے۔
(۴-۱/۸۳) یہ اس وقت ہوگا۔ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶-۵/۸۳) حسب عام انسانیت ربوبیت عالمینی کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس وقت فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس قوم کی جڑ کٹ جائے گی جو سلب و نہب سے دوسروں کی محنت کی کمائی ہضم کر جاتی تھی۔
الحمدللہ

یہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے۔ اس کے دوسرے ٹکڑے کو سامنے لانے سے پہلے میں اس عظیم حقیقت کو دہرا دوں کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا) قرآن کریم نے اپنی دعوت کا آغاز الحمدللہ رب العالمین سے کیا تھا۔ یعنی خدا اپنی ربوبیت عالمینی کی وجہ سے مستحق حمد و ستائش ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس کی یہ ربوبیت، براہ راست قائم نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے اور یہ قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک ان ظالموں کی جڑ نہ کٹ جائے جو اس کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل رہتے ہیں۔ لہذا ظالم قوم کی جڑ کٹے بغیر، نہ ربوبیت عالمینی وجود میں آ سکتی ہے۔ اور نہ ہی نوع انسان کی زبان پر بے ساختہ الحمدللہ رب العالمین آ سکتا ہے۔ اب پوری آیت کو دیکھیے فرمایا کہ:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۴۵)

اور یہی اس جماعت کی دعوت کا منتہی تھا جو اس انقلاب کی داعی بن کر اٹھی تھی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰/۱۰)

وحی کی راہنمائی

لیکن یہ نظام وحیٔ خداوندی کی راہنمائی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بات میں محض عقیدتاً نہیں کہہ رہا حقیقتاً کہہ رہا ہوں اور یہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انسانی جسم کی طرح، انسانی زندگی کے مسائل ایک دوسرے انسانی زندگی کے مسائل اسی صورت میں سلجھ سکتے ہیں کہ انسان کو کلیتاً ---- (AS-A-WHOLE) سامنے رکھا جائے۔ وحی خداوندی نے انسان کو کلیتاً سامنے رکھ کر ایسی مستقل جامع اقدار دی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے انفرادی اور اجتماعی زندگی نکھرتی اور سنورتی چلی جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ وحی خداوندی ایک مکمل فارمولا دیتی ہے جسے اگر بجملہ عمل میں لایا جائے تو متعینہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس کے بعض اجزاء (بلکہ کوئی جزو بھی) چھوڑ دیا جائے تو مطلوبہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ یہی صورت انسان کے معاشی مسئلہ کی ہے۔ اسے اگر اس کی زندگی کے دیگر مسائل سے الگ رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اور الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ آپ سوچئے کہ اگر قرآن کے اس معاشی نظام کو جس کا خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اور جس کی رو سے ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر لے لیتا ہے۔ کسی ایسی سوسائٹی میں رائج کر دیا جائے جس کے افراد کام چور اور ست الوجود ہوں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یا اگر رزق کی فراوانیاں ایسی قوم کے ہاں آ جائیں جو عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی ہو تو ساز و سامان زندگی کی یہی افراط ان کے ہاں کس قدر تباہی لے آئے گی۔ قرآن کی شہادت کے مطابق "کتنی ایسی بستیاں تباہ ہو گئیں جن میں رزق کی بڑی فراوانی تھی۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کوئی آباد نہ ہوا۔" (۲۸/۵۸) لہٰذا کوئی فلسفہ زندگی 'کوئی نظام حیات' جو انسان کو ایک طبعی مشین تصور کر کے، صرف اس کی روٹی کا مسئلہ حل کرنے کی فکر کرتا ہے کاروان انسانیت کو کبھی اس کی منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ قرآن انسانی زندگی کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا ایک گوشہ یا پرتو اس کا معاشی نظام ہے۔ اس کے اس کلی نظام حیات کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ انسانی زندگی اس کے جسم کی طبعی مشنری کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس

(HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔

انسانی ذات

اگر زندگی کی موجودہ سطح پر اس کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات کی نشوونما' وحی کی رو سے عطا شدہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک مستقل قدر یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لیے دے گا' اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ الذی یوتی مالہ یتزکی O (۹۲/۱۸) وہ جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ عصر حاضر کا مشہور ماہر علم النفس (ERIC FROMM) اس حقیقت کو اپنے انداز میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا مقصد (TO HAVE) نہیں بلکہ TO BE ہونا چاہیے۔ جسے قرآن' انسانی ذات کی نشوونما اور اس کا ارتکاز کہہ کر پکارتا ہے۔ جو مال دینے سے حاصل ہوتا ہے یعنی (TO HAVE) کے برعکس زندگی کا مقصد قرار دینے سے آپ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں علم انسانی کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے' قرآنی دعاوی کی صداقت کس طرح نکھر کر سامنے آتی جاتی ہے۔ (۴۱/۵۳) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کا معاشی نظام قائم ہی ان لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے جو وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ (اسے ایمان بالاخرت کہا جاتا ہے)

ایمان بالآخرۃ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی دوسروں کو سامان نشوونما مہیا کرنے کا انصرام) وہی کر سکیں گے جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (۳/۴۲۷/۴۱/۳) الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۴۱/۷) آخرت کا منکر ایتائے زکوٰۃ کر ہی نہیں سکتا۔ بات بالکل واضح ہے جو شخص سمجھتا ہے کہ زندگی بس یہی طبعی زندگی

ہے۔ اسے خوشحالی سے گزار لینے والا کامیاب ہے۔ اس کے لیے وہ جذبہ محرکہ کیا ہو سکتا ہے جس کی رو سے وہ جان مار کر محنت کرے۔ اپنے لیے کم از کم رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لیے دے دے۔ اگر آپ کسی ہنگامی تحریک سے اس کے دل میں اس قسم کا جذبہ پیدا بھی کر دیں تو وہ۔ اگر ماند شبے ماند' شب دیگر نمی ماند۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ شعلہ مستعجل افسردہ ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ سرمایہ داری پھر اس کا شعار بن جائے گی۔ سرمایہ پرست' آخرت پر ایمان نہیں رکھتا' یہی وجہ ہے کہ جب قرآن اس نظام کے نمائندہ قارون۔ سے کہتا ہے کہ وہ اس انسانیت کش نظام باطل کو چھوڑ دے تو اس کی جگہ جس نظام کو تجویز کرتا ہے اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے۔ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (۲۸/۷۷) اس مال و دولت میں سے' اس دنیا کی زندگی کے لیے حصہ بھی لے اور آخرت کا گھر بھی سنوار۔ اور یہی آرزو اس جماعت کے دل میں بھی مچلتی ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی پیامبر بن کر اٹھتی ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کر دے اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ اور یہ چیز وحی کے عطا کردہ نظام حیات کی رو سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ایک پر تو قرآن کا معاشی نظام ہے۔ میں نے اپنی کتاب نظام ربوبیت میں شرح و بسط سے بتایا ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کا معاشی نظام اس لیے کامیاب نہیں ہوا (اور نہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے) کہ اس نظام کے علمبردار نہ وحی پر ایمان رکھتے ہیں نہ اخروی حیات پر۔ ان کے ہاں وہ اساس نہیں ہے جس پر اس قدر عظیم نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خود مسلمانوں کے ہاں بھی یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکے گا کہ قوم کو وحی کی صداقت اور اخروی زندگی کی حقیقت پر یقین محکم ہو۔ اس کے لیے پہلے قوم کے دل و دماغ میں بنیادی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت یہ ایمان رسمی الفاظ سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کے معاشی نظام کی وہ کڑیاں آپ کے سامنے

رکھ دیں جن سے وہ اسے تدریجاً اس کے نقطۂ آغاز سے مقام تکمیل تک لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کا قیام اسلامی مملکت ہی میں ممکن ہے۔ (اسلامی مملکت وہ ہے جس کا جملہ کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا) اسلامی مملکت جب اور جہاں بھی قائم ہو' اسے معاشرہ کی اس وقت کی حالت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اس نظام کی کون سی کڑی سے ابتداء کرے تاکہ اس کا قیام ممکن العمل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سطحی جذبات پرست' ابتداء ہی سے اس کی آخری منزل اختیار کرنے پر زور دیں گے اور یوں یہ حقیقت شاعری بن کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف وہ جس کی نگاہ قرآن کے کلی نظام حیات پر نہیں ہو گی۔ وہ اسے سرے سے ممکن العمل ہی نہیں سمجھے گا اور اسے (بزعم خویش) "فطرت انسانی" کے خلاف قرار دے گا۔ (جیسا کہ آج کل' نظام سرمایہ داری کے نقاب پوش حامی عام طور پر کہہ دیتے ہیں) لہٰذا اس نظام کے علمبرداروں کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ اپنا نصب العین تو اس کی آخری منزل قرار دیں لیکن اس تک پہنچنے کے لیے عملی قدم بتدریج اٹھائیں۔ اسی طریق سے قرآن کا معاشی نظام صدر اول میں قائم ہوا تھا اور اسی طریق سے یہ اب قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں البتہ ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ جب حضور نبی اکرمؐ نے اس انقلاب کی آواز بلند کی تھی تو آپ اکیلے مسلمان تھے۔ باقی سب غیر مسلم تھے۔ لیکن اب اسلامی مملکت کے باشندے مسلمان ہوں گے اس لیے ان سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کا نظام ہے اور قرآن پر تم ایمان رکھتے ہو۔ اس لیے تمہیں اس کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس جہت سے ہمارا مرحلہ نسبتاً آسان ہو گا۔ لیکن شاید اسی جہت سے ہمارا مرحلہ زیادہ مشکل بھی ہو۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' رسول اللہؐ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اس کے بعد جتنے حضرات اسلام لائے' انہوں نے سمجھ سوچ کر اسلام قبول کیا۔ انہوں نے دین کے ایک ایک گوشے پر غور و فکر کیا۔ اس طرح وہ دل اور دماغ کے کامل یقین اور اطمینان کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے جب انہیں اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کہا گیا تو یہ ان کے لیے نامانوس نظام نہیں تھا۔ ان کا اس کی نفع بخشیوں پر یقین اور اس کی حکمیت پر

ایمان تھا۔ لیکن اب دنیا میں کوئی خطہ زمین بھی ایسا نہیں جہاں کے مسلمان اس طرح ایمان لائے ہوں۔ اس لیے اگر کوئی مملکت اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنا چاہے گی تو اسے ان مسلمانوں کو (قرآن کے الفاظ میں) از سرِ نو مسلمان کرنا ہو گا۔ (۴/۱۳۶) اس کے خلاف سرمایہ دار طبقہ اور مذہبی پیشوائیت محاذ قائم کرلیں گے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اسلام وہ ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا اور اس کے صحیح اسلام ہونے کی سند یہ ہے کہ وہ "اسلاف کا مسلک" ہے۔ مسلمانوں کی جو مملکت ان قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ وہی اس نظام کو قائم کر سکے گی۔ لیکن اگر یہ اسے اپنے ہاں قائم نہیں کریں گے تو دنیا کی کوئی اور قوم اسے اختیار کرے گی۔ قرآن تو پہلے ہی کہہ رہا ہے کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اگر تم اس سے اعراض برتو گے تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

اس مقام پر میں اس حقیقت کو ایک بار پھر واضح کر دوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روس یا چین نے اس نظام کا آغاز کر دیا ہے تو یہ اگر مغالطہ آفرینی نہیں تو خود فریبی ضروری ہے۔ وہاں نہ اس نظام کو شروع کیا گیا ہے' نہ ہی یہ نظام چل سکتا ہے۔ مارکس نے کہا تھا کہ نوع انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل اس بنیادی اصول میں ہے کہ "ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ۔" لیکن اسے وہ جذبہ محرکہ نہ مل سکا جس سے لوگ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس لیے اس نے اس نظام (کمیونزم) کی جگہ سوشلزم کا نظام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس سے انسانیت' نظام سرمایہ داری سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑی گئی۔ جس نظریہ حیات میں نہ خدا پر ایمان ہو نہ مستقل اقدار پر۔ نہ انسانی ذات پر ایمان ہو نہ اخروی زندگی پر' اس کی رو سے نظام ربوبیت کس طرح کارفرما ہو سکتا ہے؟ انہیں اس کے لیے بنیاد ہی نہیں مل سکتی۔ اسی لیے اقبال نے اس کے بارے میں کہا تھا۔

ایکہ می خواہی نظام عالمے
جستہ اورا اساس محکمے؟

نہ ہی یہ نظام "مروجہ اسلام" کی رو سے قائم ہو سکتا ہے جو خود نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ یہ صرف قرآن کی رو سے قائم ہو سکتا ہے۔

غلام احمد پرویزؒ